مکلی کا قبرستان، ایک اہم ثقافتی، ادبی ورثہ

CEMETERY OF MAKLI: AN IMPORTANT CULTURAL AND LITERATURAL HERITAGE

Syed Asad Ali Kazmi

Abstract

Mukli Cemetery is the second largest cemetery in the Muslim world which was declared a World Heritage Site by UNESCO in the 1980s. Unfortunately, no significant research is available on this heritage, especially for the Urdu-speaking class. There is room for a large collection of research material in the form of poems and prose fragments from Persian artefacts from Mukli's cemetery, which shows the history, cultural attitudes, and especially the funeral rites of that era, as well as the regional ways of emotional expressivity to the deceased. While highlighting the cultural significance of this cemetery, this article presents important material on Persian poetry and literature.

Key words: *Makli, Persian, poetry and literature, Cemetery.*

خلاصہ

مکلی کا قبرستان مسلم دنیا کا دوسرا بڑا قبرستان ہے جسے یونیسکو نے ۸۰ء کی دہائی میں عالمی ثقافتی ورثے کا درجہ دیا۔ بدقسمتی سے ابھی تک اس ورثے کے متعلق کوئی قابل ذکر تحقیق علی الخصوص اردو دان طبقے کے لئے میسر نہیں ہے۔ مکلی کے قبرستان سے فارسی آثار میں سے اشعار اور نثری ٹکڑوں کی صورت میں بہت سا تحقیقی مواد جمع کرنے کی گنجائش موجود ہے جو اس عہد کی تاریخ، ثقافتی رویوں، اور علی الخصوص تدفین کی رسوم، نیز فوت شدگان سے جذباتی وابستگی کے اظہار کی علاقائی روشوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ زیر نظر مقالہ میں اس قبرستان کی ثقافتی حیثیت کو اجاگر کرنے کے ضمن میں یہاں موجود فارسی شعر وادب کے آثار پر بھی اہم مواد پیش کیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ: مکلی، فارسی، شعر وادب، عالمی ورثہ، قبرستان۔

تعارف

مکلی، ٹھٹھہ، سندھ کا ایک قصبہ اور تقریبا چھے کلومیٹر کے دائروی علاقے پر مشتمل ایک ٹیلہ نما پہاڑی علاقہ ہے۔ اس علاقے میں مسلم دنیا کا دوسرا بڑا قبرستان موجود ہے جسے مکلی کا قبرستان کہا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس قبرستان میں چھے ملین سے زائد قبور موجود ہیں جس میں ایک بڑی تعداد کا تعلق سما اور ارغون بادشاہت کے خاندانوں، بڑی شخصیات اور وزراء کی قبور سے ہے۔ ۲۰۱۸ میں ہونے والی مکلی کانفرنس کے شرکاء کی آراء کے مطابق اس عالمی ورثے کو جسے یونیسکو نے ۱۹۸۰ کی دہائی میں عالمی ثقافتی ورثے کا حصہ قرار دیا، تحقیق اور حفاظتی اقدامات سے خالی ہونا ایک بڑے ثقافتی خزانے کو تباہی سے دوچار کرنے کے مترادف ہے۔ مکلی میں فارسی زبان وادب کے ان گنت آثار موجود ہیں جو ایک طرف تو اس پورے علاقے کی ثقافت اور زبان پر فارسی اثرات کے لئے حوالہ جاتی اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں اور دوسری جانب کلاسیکی شعر وادب کا ایک نادر خزانہ ہیں۔ ارغون اور سما بادشاہتوں کے زمانے میں ہنر اسلیمی اور عربیک اسلیمی ڈیزائن کی قبور مکلی کے اس نادر ورثے کی خوبصورتی اور تحقیقی و ثقافتی اہمیت میں مزید اضافہ کرتی ہیں۔ امیر خسرو اور کلاسیکل دہلوی و لکھنوی شعراء کے کلام میں مکلی کا حوالہ ماضی کے اس تجارتی اور ثقافتی نیز تصوف کے مرکز کے تعارف میں سندھ کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سندھ کے فارسی شعراء کے کلام میں مکلی کا حوالہ اس کی اہمیت کا آئینہ دار ہے۔ ماخذات اولیہ کی کمی اور موضوع پر قابل ذکر تحقیقی مواد کی عدم دستیابی کے باوجود زیر نظر مقالہ میں کوشش کی گئی ہے کہ ایک طرف اس عالمی اسلامی ورثہ کی اہمیت اجاگر کر دی جائے اور دوسری طرف برصغیر پاک و ہند میں فارسی زبان وادبیات کی تاریخی اہمیت اور نفوذ کو بھی اجاگر کر دیا جائے۔

مکلی کی تاریخ

مکلی کی نزدیکی تاریخ پر حسام الدین راشدی کا کام قابل ذکر ہے۔ البتہ یہ مکلی کے قبرستان اور اس میں موجود فارسی شعر وادب کے آثار سے زیادہ علاقائی نوعیت کی تاریخ ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ حسام الدین راشدی کی تاریخ نویسی میں جابجا خداداد خان کی بیاض سے استفادہ کیا گیا ہے۔ بیشتر مقامات انہی کے فٹ نوٹس سے بھرے ہوئے ہیں۔ تاریخ نویسوں کے لئے مکلی کے سنگی کتبے اس قدر اہم نہیں تھے لیکن ان میں کے بعضے محققین کو افغانستان، مرکزی ایشیا، ایران اور ہندوستان سے متعلق بڑے مقابر نے اپنی جانب متوجہ ضرور کیا۔ حتیٰ کہ مغل شہزادے داراشکوہ نے اپنی یادداشتوں میں مکلی میں اہل تقدس کی تدفین اور ان کے قطعاتِ تاریخ کا تذکرہ کرنے کو ضروری سمجھا۔ مکلی کا شہر جو ٹھٹھہ کے ساتھ تقریبا متصل ہے، کراچی سے کوئی سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ تقریبا نو کلومیٹر کے رقبے پر پھیلا ہوا یہ قبرستان جس کے دو کنارے "ساموئی" اور "پٹھو پیر" کے نام سے

معروف ہیں، دراصل مکلی کی وہی چھے پہاڑیاں ہیں جو قدیمی زمانے کی متمدن ٹھٹھہ پورٹ کے ذرا فاصلے پر شہر خموشاں کی آبادی کہلاتی ہیں۔ یہاں کے ایک انداز کے بنے مقبروں اور قبور میں ایرانی ساخت جھلکتی ہے اور فارسی مصرعوں اور جملوں کی وافر مقدار حیرت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ مکلی اپنی اس وسعت کے ساتھ مسلمان جغرافیے کا دوسرا بڑا قبرستان ہے۔ البتہ بعض کے مطابق یہ دنیا کا پانچواں بڑا قبرستان ہے جس سے پہلے وادی السلام، عراق کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ یونیسکو نے اپنی ایک رپورٹ میں مکلی کی پہاڑیوں کے متعلق کچھ یوں لکھا ہے:

"مکلی اپنی طرز کا واحد اور منفرد عالمی ورثہ ہے اور یہ عالمی ورثہ صوبہ سندھ میں ٹھٹھہ کی چھے عدد پہاڑیوں میں اس کے دیہاتی علاقے سے اوپر کی جانب واقع ہے۔ اس میں شعراء، سلاطین اور مذہبی رہنماؤں کے مقابر شامل ہیں۔ جن کا تعلق ساتویں صدی سے چودہویں صدی ہجری تک کا ہے۔ ان میں چھے مختلف مناطق میں موجود 21 زیارت گاہیں شامل ہیں اور ان کی تباہی کا خطرہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا ہے۔ دریائے سندھ کے قدیم راستے پر واقع 1000 ہیکٹر سے زائد رقبے میں 64 اہم مقبرے اور پانچ سے دس لاکھ کے درمیان قبور شامل ہیں۔ جن کا زمانہ ساتویں سے چودہویں صدی ہجری تک کا ہے۔ اس سائٹ کی ایک جدید ٹیم کے ذریعے حفاظت کی جارہی ہے مگر مکرر عوامی آمدورفت، بجٹ کی کمی، دیکھ بھال کا فقدان، حفاظتی وتعمیری مواد کا نہ ہونا، ہوا اور نمک کے مقابر پر اثرات وغیرہ ایسے جدید خطرات سے ہیں جن سے نمٹنے کا کوئی معقول انتظام موجود نہیں ہے۔"[1]

2019 کی اسپین کی ایک مانیٹرنگ موومنٹ اسی باب میں کچھ یوں رقم طراز ہے: "2018 کے اوائل میں ڈاکٹر متھائس بیک نے ایک اہم تحقیق انجام دی جس کا مرکزی نکتہ مکلی کا جام نظام الدین کا مقبرہ تھا۔ اس تحقیق کے مطابق مقبرے کی تعمیری صورتحال، ارضیاتی پوزیشن اور دوسرے ساختی ڈھانچے اسی خطرناک پوزیشن کا سامنا کر رہے تھے جس کے انجام اس عظیم ورثے کی تباہی پر منتج ہوتا ہے۔" ایک اور جگہ لکھتے ہیں: " اس ورثے کی تباہی سے بچنے کا پہلا کام کریک مانیٹرنگ کے اہم پروٹوکولز کا قیام وتنصیب تھا۔ کراچی میں موجود آرکائیوز کی ورق گردانی کے دوران بہت سے پرانے فوٹو ملے جن کی اکثریت برٹش دور اور بیسویں صدی کے اوائل کی ہے اور اسی طرح سائٹ کے وزٹ کے دوران بھی پلاسٹک اور شیشے کے بہت سے کریک مانیٹرنگ کے ٹولز نظر آئے جن کے بارے میں حیرت انگیز طور پہ کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں تھا۔ بالکل اسی طرح موجود مانیٹرنگ پروٹوکولز پر بھی کسی قسم کی تاریخ اور معلومات موجود نہیں ہیں۔"[2]

یاد رہے کہ اسی رپورٹ میں جام نظام الدین کے مقبرے میں بیس سے زائد خطرناک کریکس کی موجودگی کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ اس قسم کے بعض دیگر آثار واظہارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکلی کی تباہی کے لیے اب ہمیں اگلی نسل تک کے انتظار کی ضرورت نہیں بلکہ ہم لوگ ہی لوگ اس عالمی ورثے کو اپنے ہاتھوں سے جاتا

دیکھیں گے۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ یونیسکو نے 80 کی دہائی میں ہی مکلی کو عالمی ورثے کی فہرست سے نکالنے کی دھمکی دے دی تھی۔ موجودہ صورتحال میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مکلی کا قبرستان 2010 کے سیلاب اور اس کے بعد قبضہ گروپوں کی دست برد کا شکار ہو کر اپنے باقی ماندہ ورثے سے بھی محروم ہوتا جارہا ہے۔ یونیسکو نے 2018 میں عالمی ورثے سے نکالنے کی دھمکی دے کر اس بات پر قریبا" مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ چنانچہ وہی عالمی ورثہ جسے کبھی اس کی اہمیت سے متاثر ہو کر "ایل ڈوراڈو" کہا گیا تھا، اسی سنہری سرزمین کی طرح لٹتا جارہا ہے جس کا ذکر اس لقب کے پس منظر میں خوابیدہ ہے۔

تاریخی پس منظر

قرون وسطی کا جنوبی ایشیاء اپنے آس پاس کی جدید دنیا سے بہت مختلف تھا۔ بعض یونانی تاریخ کے محققین کے مطابق یہ علاقہ اسکندر اعظم کی تاخت و تاراج کا بھی ہدف رہا۔[3] حیرت انگیز طور پر دلچسپ اور تجسّس ابھارتی ثقافتی اقدار اور ان کی بہت سی رائج شکلیں جو بعد ازاں پیدا ہونے والی جمالیات سے متعلق ایک مقدمے کی حیثیت رکھتی تھیں۔ بعض ذہین مبصرین نے اس بنیاد کی تلاش کے لئے بہت ساری وجوہات تلاش کیں، جو ماضی کی بہتر تفہیم کے لئے صدیوں کے فاصلوں کے مابین پلوں کی تعمیر میں معاون ہو سکتی ہیں۔ ٹھٹھہ اسی زمانے کو تاریخ سے ملاتا ہوا نیز ایک بہت مصروف بندرگاہ کی حیثیت سے اس وقت تک قابل رسائی دنیا کے تقریبا نصف حصے کو ایک مرکزی بندرگاہ سے جوڑنے والا ایک حیرت انگیز شہر اور ایک خوشحال تجارتی مرکز تھا۔ مکلی نے ٹھٹھہ شہر کے ایک لازمی حصے، یعنی قبروں پر بنی ہوئی شبیہوں اور تحریروں کو جسے ٹھٹھہ کی ثقافت کا ایک اہم لیکن انتہائی خوبصورت حصہ کہنا چاہیے، اپنی آغوش میں بچا کر رکھا ہے۔ یہ اس قصبے کے فنون لطیفہ کی وہ تاریخ ہے جس نے ٹھٹھہ کو تاریخ میں روشن رکھا ہوا ہے۔ مکلی کا قبرستان ایشیاء اور افریقہ کے سب سے بڑے مسلم قبرستان میں سے ایک ہے جس میں قرون وسطی کے شہر کی ترقی کی نادر نمونوں کی روایت، تولیدی صلاحیت کی حامل ایک اہم بندرگاہ کے مٹتے ہوئے آثار، ایک متحرک معاشرے میں معماری کے رجحانات کا خیر مقدم کرنے، وسیع بحری تجارت اور ادب کے بیان اور فنون لطیفہ سے محبت کرنے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ ٹھٹھہ ایک وسیع و عریض علاقے کو سمیٹتے ہوئے تجارت کی ضروریات کو پورا کرنے والی تعلیم، روزگار اور وسیع تجارتی سامان مہیا کرنے والی ایک بڑی آبادی تھی جو ایشیا کے ایک پر کشش شہروں میں سے ایک تھی۔[4] موجودہ مطالعے میں عالمی معاشرتی ورثہ، مکلی سے متعلق نیز ٹھٹھہ کے قبرستان اور اس کی خطاطی کے جوہر اور روح کو حاصل کرنے کے لئے صرف انگشت شمار جامع دستاویزات دستیاب ہیں۔ یہ حقیقت قرون وسطی کے دور کی تاریخ نگاری کے نئے سرے سے پڑھنے کی طرف اشارہ کرتی ہے، جس میں شامل مواد کے تجزیاتی مطالعہ کی دوبارہ سے ضرورت ہے، چاہے

وہ مقدس کتابوں سے استخراج شدہ ہو یا عام نوعیت کا ہو، جس میں جامع اعداد وشمار کی مدد سے مکلی اور اس قبرستان میں موجود تمام متن کا احاطہ کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس میدان میں کسی اچھے اسکالر اور ماہر کا کام، ٹھٹھہ مکلی کے ماضی کی مزید تحقیقات اور مطالعہ کے لئے بہت سارے امکانات کا دروازہ کھول سکتا ہے۔

یونیسکو عالمی ثقافتی ورثہ کی توقعات

یونیسکو کی 2016 کی مکلی کے قبرستان کے بارے میں شائع ہونے والی رپورٹ ایک ایسی دستاویز ہے جو مناسب طور پر اس ثقافتی ورثے کی تفہیم کے سلسلے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ مزید برآں، یہ اس کے تحفظ کی اہمیت کا احساس کرنے کے لئے بھی راہنما کردار ادا کر سکتی ہے اور آخر کار اسے ایک مناسب تحقیقی مطالعے میں اہم کردار کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ آج ٹھٹھہ شہر کی زندگی کو پڑھنے میں مکلی کا حوالہ ایک بنیادی ضرورت ہے۔ خاص طور پر یہ تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ ایک روشن دن میں جدید دنیا کے ماہرین آثار قدیمہ کا اس شہر کا مشاہدہ و مطالعہ کرنے کے لئے آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ مکلی میں بڑی تعداد میں قبور کی موجودگی، مقبروں کی عمارتیں، ان کے پلیٹ فارم اور سب سے بڑھ کر ان کے نقش ونگار جو پوری دنیا میں اپنی مثال آپ ہیں اس بات میں کوئی شبہ نہیں چھوڑتے کہ یہ جگہ مردوں کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے زندہ لوگوں کی بھی پسندیدہ جگہ ہے۔[5]

مکلی کے حوالے سے ایک مغربی شہری کا مشاہدہ ہے: "یہاں محنت اور وسعت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی گئ لیکن افسوس کی بات یہ ہے جس شخص کے لئے یہ کام انجام دیئے جاتے ہیں، وہ مر چکا ہوتا ہے۔ پھر یہ مشاہدہ کرنے والا گویا نوحہ کرتا ہے: شاید یہ جگہ مردہ لوگوں کو زندوں سے بہتر رہائش فراہم کرنے کے مضحکہ خیز مقصد سے پُر ہے۔"[6] یہاں کی زیادہ تر قبریں چودھویں صدی سے متعلق ہیں جن کے بارے میں ابتدائی حوالہ جات ان کے بارے میں بالواسطہ نوعیت کی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ لیکن یہ ایک ایسی سرگذشت ہے جسے شہر کی تاریخ سے نکال کر پھینکا نہیں جاسکتا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قرون وسطیٰ کے وسطی ایشیاء کی سرگذشت میں مکلی کے قبرستان اور ٹھٹہ کی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش باب موجود ہے۔ ایشیا کی تاریخ میں بہر حال موجود رہے گا چاہے اشاراتی طور پر ہی سہی لیکن ذکر تو ہو گا اس خطے میں ایک ایسا قبرستان موجود تھا جو خطے کی سماجی اور جغرافیائی تبدیلی میں پوری طرح سے شریک تھا۔ دریائے سندھ کے ڈیلٹا میں قائم بندرگاہوں اور دیگر تجارتی مقامات کے بارے میں کسی بھی قسم کی مبسوط معلومات کا کوئی ایک مستقل ذریعہ نہیں ہے۔ لیکن ان سب میں مشترکہ طور پر پرانی بندرگاہوں کے تسلسل سے موجود رہنے کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے، جو خود ٹھٹھہ کی بندرگاہ کی اہمیت کی ایک بہترین دلیل ہے۔ تاریخ مبارک شاہی، جس میں لکھا گیا ہے کہ سلطان معیز نے اچ کے بادشاہ کے خلاف فوجی

چڑھائی کی تھی۔ وہاں بھی ٹھٹہ کی بندرگاہ کو ایک اہم ترین تجارتی اور کاروباری شہرت کے حامل مرکز کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

محققین کی دلچسپی کا موضوع

مکلی ایک قبرستان ہی نہیں، امنگوں اور آرزوؤں کا مدفن بھی ہے۔ مکلی کے قبرستان میں قبور کی تیاری کا سرمایہ فراہم کرنے والوں، ماسٹر کاریگروں اور دانشوروں، جنہوں نے مکلی کے قبرستان کی حدود اور ثقافتی اہمیت کو اس زمانے تک باقی رکھنے اور اس کی معماری میں کرنے میں مدد کی، ان کی مناسب تحقیق کی جانی چاہیے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ جو بھی کردار ٹھٹھہ میں شہرت پایا، خصوصا" مکلی" کے بارے میں، اس کا کردار نامعلوم ہی ہے۔ چاہے اس کی اہمیت زیادہ تھی یا کم؛ مخصوصا شعراء اور دست کار کاریگر۔ امیر نامی محقق کے مطابق بہت سے پاکستانیوں کے ساتھ اسلام کے تاریخ دانوں اور اسلامی آرٹ کے ماہرین بھی اس بات سے عمومی طور پر ناواقف دکھائی دیتے ہیں کہ اس علاقے میں چودھویں صدی تک کے زمانے کا ایک فعال ثقافتی اور تاریخی مرکز پایا جاتا ہے۔ اور یہاں تک کہ ایک فروغ پذیر دستکاری مرکز کے طور پر بھی اسے کبھی اہم نہیں سمجھا گیا۔ جبکہ ٹھٹھہ اور مکلی کی پہاڑیاں صوبہ سندھ کے اہم حصے میں سے ایک شمار ہوتے ہیں اور اصولاً مکلی کو ملک کے تاریخی مقامات میں سے قابل ذکر ترین مقام ہونا چاہیے۔

ایک نامور مستشرق کے مطابق مکلی کی پہاڑی شمال سے جنوب تک چار یا پانچ میل تک وسعت رکھتی ہے اور یہ ایک وسیع قبرستان ہے۔ ادبی حوالوں میں بھی ٹھٹھہ سینکڑوں سال کی مدت تک مسلسل تذکروں میں آتا رہا ہے۔ بھارت پرانتو سروے (قبل از تقسیم ہند) میں ذکر ہے کہ اس ایک ملین سے زائد قبروں پر مشتمل قبرستان کے تذکرے میں ایک شاعر اچ کے بارے میں ذکر کرتا ہے جہاں صرف ایک مشہور قبر ہے اور پھر اس کے حوالے کے طور پر مکلی اور ٹھٹھہ کا ذکر کرتا ہے۔ ٹھٹھہ اور مکلی دونوں ہی مشہور شہر ہیں جن کو ہمیشہ ایک شہر کے طور پر نہیں سمجھا جاسکتا، حالانکہ یہ دونوں جگہیں گذشتہ چند صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ کھڑی ہیں اور ایک دوسرے کا لازمہ شمار ہوتی ہیں۔ لیکن بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ قرون وسطی کے زمانے میں اس وقت کے ٹھٹھہ کے قصبہ کو حیات بخش ہوا اور ماحول اور آج مکلی کو موجودہ دور کے قصبہ ٹھٹھہ کو شمال مغربی جانب واقع ہونے کی وجہ سے نسبتا مختلف تصور کیا جاسکتا ہے۔ مکلی اور ٹھٹھہ کے ابتدائی حوالے زیادہ تر 14 ویں صدی سے متعلق ہیں۔ اگرچہ یہ بالواسطہ ہیں، اور قصبے کی اصل کی تاریخ پر زیادہ روشنی نہیں ڈالتے لیکن پھر بھی یہ کچھ اشارے ضرور فراہم کرتے ہیں جن سے کچھ تاریخی اور کچھ نئے پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

اس قصبے اور اس کے قبرستان کے وجود کے بارے میں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اس خطے میں کافی سماجی اور جغرافیائی تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ مختلف ادوار میں بعض باہم منسلک واقعات پیش آئے جن میں ایک تو بڑی تیزی سے دریا کا راستہ تبدیل ہونا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دریا کی طغیانی نے بہت سے تہذیبی ذخائر کو تباہی سے دوچار کر دیا۔ اسی طرح پہلے سے قائم شدہ بندرگاہوں کی نئی ترتیب وانتظام اور نئی بندرگاہوں کے نئے بازار وجود میں آجانا اہم تبدیلیاں تھیں۔ معاشی ضروریات کی قوت سے چلنے والے اس خطے کو کسی بھی وجہ سے نئی بندرگاہوں کی دوبارہ قیام پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بعض جگہ اس تاریخ میں پرانی بندرگاہوں کے ناموں کے مستقل استعمال کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ تاریخ مبارک شاہی، سال 838 AH میں لکھاہے: "یہ وہی بادشاہ ہے کہ جس کا نام معزالدین سام غوری ذکر کیا جاتا ہے، اسی نے اچ کے خلاف فوجی چڑھائی کی تھی۔ جبکہ یہ ملتان اور دیبل کا حکمران تھا۔" [7]

اسی طرح طبقات اکبری میں بھی ٹھٹھہ کا مبسوط ذکر پایا جاتا ہے۔ اس طرح کے حالات میں ٹھٹھہ کا جو بھی کردار تھا لیکن تاریخ میں اسے ایک ترقی پذیر ہنرمندی اور ثقافتی بڑھوتری کے مرکز کے طور پر جانا جاتا تھا جس میں 14 ویں صدی کی مخصوص ثقافتی زندگی موجود تھی، اور یہ سلطنت کا ایک دور دراز لیکن اہم مقام ہونے کی قابلیت سے بہرہ ور تھا۔ عین اسی زمانے میں مکلی بھی اس جگہ کی ایک قابل تقدس ثقافتی نشانی کے طور پر ابھر رہا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ابن بطوطہ نے چودھویں صدی میں اپنے کے سفر نامے میں ٹھٹھہ کا ذکر نہیں کیا جبکہ اس وقت تجارت میں یہ شہر یمن اور فارس کے ساتھ منسلک تھا جس کی بندرگاہ کی سالانہ آمدنی اس وقت قریب چھ لاکھ روپے تھی لیکن ابن بطوطہ کا ذکر نہ کرنا یہ ثابت نہیں کرتا کہ اس وقت ٹھٹھہ موجود نہیں تھا۔ دراصل یہ شہر دہلی سے دشمنی کے رشتے میں منسلک تھا۔ جیسا کہ اس کہانی اور اس کے متعلقات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تخت دہلی کے ایک دعوے دار اور ولی عہد نے ٹھٹھہ میں پناہ لی اور خود کو محفوظ سمجھا۔شاید تبھی ابن بطوطہ نے دہلی کے بادشاہ کے دربار میں حاضر خدمت رہنے کی وجہ سے غالبا" اس شہر میں داخل ہونا مناسب نہیں سمجھا۔

سلطان محمد تغلق کی موت اگرچہ ایک معروف حقیقت تھی، لیکن اس حقیقت کو بھی تاریخ نویسوں نے ٹھٹھہ سے متعلق قرار دے کر رجسٹر نہیں کیا۔ بلکہ ایک عمومی واقعہ ہی قرار دیا۔ دہلی میں موجود تاریخی تحریروں میں بھی ٹھٹھہ کی موجودگی کی شہادت دی گئی ہے۔ جب سلطان محمد تغلق کے آخری ایام (وفات: 1351 عیسوی) قریب آئے تو اس وقت وہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ ٹھٹھہ کے قریب تھا۔ بارش کے موسم کے ساتھ ساتھ مالی وغذائی تنگی بھی شاہی لشکروں کے مجبور ہو کر وطن واپس جانے کی وجہ بنی تھی۔[8] اس زمانے کے مورخوں کو شاید ٹھٹھہ کے بارے میں کافی مقدار میں معلومات دستیاب نہیں تھیں جیسا کہ سلطان معز کی مہم کی کوئی تفصیل مہیا نہیں ہے۔ یہ

مورخ شاید اس وقت بادشاہ کی فوجی چڑھائی کی مہم سے علیحدہ ہی رہے تھے، جس میں بادشاہ نے اپنے کسی باغی کا شدت سے تعاقب کیا تھا اور اس کی گرفتاری کی خاطر ٹھٹھہ تک لشکر لے کر چلا آیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ مورخین شاید اس شخصیت کے بارے میں بھی زیادہ معلومات سے آگاہ نہیں تھے جس کا سلطان نے ٹھٹھہ کے نواح تک بہت شدت سے تعاقب کیا تھا حتی کہ بعض لوگ تو سرے سے کسی بغاوت کا ہی انکار کرتے ہیں۔ اسی طرح اس زمانے کے مورخین سیہون میں سلطان محمد تغلق کی تدفین کے حقائق کو بھی مفصل طور پر فراہم کرنے میں ناکام رہے۔

جب ٹھٹھہ کو دہلی کی سلطنت نے فتح کر لیا تو محمد تغلق کے جانشین فیروز شاہ نے قبضہ سنبھالتے ہی سیہون کے صوفی عثمان مروندی کے مقبرے میں جمعہ کی نماز میں سلطان کے نام اور خطبہ کی تلاوت شروع کر دی۔ سیہون اور ٹھٹھہ کی دیرینہ قربت اب بھی مشہور ہے۔ ٹھٹھہ کے نزدیک محمد تغلق کی موت کی حقیقت تو ایک معروف واقعہ ہے، لیکن ان کی تدفین کے متعلق حقائق مورخین نے درج نہیں کیے۔ امیر خسرو اور دیگر مقامی شعرا کے اشعار میں اس قسم کے واقعات کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ البتہ اس طرح کی تمام تعریفیں، جو شاعرانہ مبالغہ آرائی کی طرز میں بیان ہوا کرتی ہیں ضروری طور تاریخی سیاق وسباق کے مطابق نہیں ہوتیں۔ البتہ ان کو اظہار خیال اور عمومی فکر کی عکاسی کے طور پر قبول کیا جاسکتا ہے۔ ایسی اعلی ثقافت کے حامل معاشرے میں ایک ایسی شہری زندگی کی ترتیب کا وجود میں آ جانا جہاں ایک خاص طرح کی منصوبہ بندی واضح طور پر موجود دکھائی دیتی ہے ایک اہم تاریخی گواہی ہے۔ آج ٹھٹھہ کے قصبے میں کچھ جھونپڑیوں کے آثار اور مکلی کی پہاڑی پر کھڑے کھنڈرات اس وقت کی انتہائی ترقی یافتہ ثقافت کی بڑی اچھی اور واضح شہادت دیتے ہیں۔ ایس پی جھبیلانی کے مطابق: "15ویں صدی کے دوران سما بادشاہوں کا عروج آہستہ آہستہ زور پکڑ رہا تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ دہلی کی طاقت کو بھی زوال آ رہا تھا۔ اسی دور میں ٹھٹھہ کے نواح میں بحری تجارت میں نمایاں اضافہ ہوا کیونکہ باہر سے فوجی مداخلت کا امکان کم ہی ہوتا تھا۔"[9]

البتہ ماضی میں سما بادشاہوں کی جارحیت کے دوران ایک مختلف قسم کی صورتحال پیدا ہوتی رہی۔ سابقہ تیموری سلطنت میں قبائل کے درمیان بڑھتی ہوئی عسکریت پسندی نے ایسی فضا بنا دی کہ امیر گرگان کی افواج کے ایک حصے میں ارغونوں نے اپنے کمانڈر ذوالنول بیگ ارغون کے ماتحت کام کیا، جس نے بعد ازاں قندھار کی گورنری کا عہدہ سنبھالا۔ ایسی ہی ایک مہم کا ارغون افواج کو بھاری نقصان بھی اٹھانا پڑا، جہاں ان کے کچھ اہم افراد سندھ کی قبائلی افواج کے ہاتھوں مارے گئے۔ یہ واقعہ 1490 عیسوی میں پیش آیا۔ اس طرح کے ایک تاریخی مخطوطے میں یہ ذکر موجود ہے، جہاں جام مبارک خان کی چھاپا مار کاروائی کو فخر سے بیان کیا گیا۔ اس کے بعد کے واقعات

سے پتہ چلتا ہے کہ سندھ کے مختلف قبائل نے اس شورش زدہ صورتحال کا فائدہ اٹھایا، جہاں جام فیروز (1.915-16ھ) نے سلطنت سما کے آخری حکمران کو شکست سے دوچار کر دیا۔[10]
قبائلی روایات کی ترجیحات سما بادشاہوں کے آخری دور تک مستقل طور پر پوری قوت سے موجود تھیں اور اپنا کردار ادا کر رہی تھیں۔ تاہم ارغونوں اور ترخانوں کے دور سلطنت کے آغاز کے بعد سیاسی دشمنیوں نے مقامی قبیلوں کو ٹھٹھہ کے جنوب مغرب کے علاقوں میں پسپا کیے رکھا۔اس طرح 1516-1521 عیسوی کے بعد، سندھ کی قبائلی قوتوں کی شکست کا واقعہ بھی پرانی تاریخی روایت سے مختلف رہا۔ سندھ میں ارغون اور ترخان فوجی جارحیت کے عروج کے ساتھ ہی ٹھٹھہ میں وسطی ایشیائی عمارت سازی کے فن کی مقبولیت میں تیزی سے اضافہ ہوا۔اس کو تیموری روایات کے وسیع پیمانے پر آغاز کا نام دیا جاسکتا ہے۔جس میں پتھر کی سطحوں کے استعمال کے برخلاف معماری کے فن میں سیرامکس (کاشی کاری) کو بھی قبول کر لیا گیا۔
جب قبائلی عمائدین کا اثر ارغونوں کو اقتدار میں لانے کا سبب بنا تو یہ تاریخی موڑ ٹھٹھہ شہر کے سفاکی اور تباہی کے ساتھ زوال کو ساتھ لے کر آیا تھا۔یہ سندھ کی تاریخ کے المناک ادوار میں سے ایک تھا جب شاہی خاندانوں کے علاوہ طاقت حاصل کرنے والے گروہ اپنے لیے مزید مواقع پیدا کرنے اور فوجی سازشوں کے ذریعے ایک بہتر ترقی کے حامل معاشرے کو تسخیر کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔لیکن اس واقعے نے معاشرے کے پیداواری عناصر اور فیصلہ ساز قوتوں کے مابین رابطے کو مکمل طور پر تباہ کر دیا، جس سے تجارت اور ترقی پذیر زراعت کا ایک بہت بڑا حصہ شدید متاثر ہوا۔انہی میں سے بعض قبائل کے بعد کے زمانوں میں روا رکھے جانے والے ظلم وستم اور زراعت سے وابستہ آبادی کے خلاف جارحانہ پالیسیوں نے حکمرانوں اور مقامی افراد کے مابین ایک خلیج پیدا کر دی۔اس فرق نے ثقافتی امنگوں کو بری طرح متاثر کیا، اس کے علاوہ باغی قوتوں کو زراعت سے وابستہ آبادی میں شدت کے ساتھ حکومت سے بغاوت کا خیال پیدا کرنے میں کامیابی حاصل ہو گئی۔لیکن اس سب کے دوران مقامی کاریگر نے بہت نقصان اٹھایا۔البتہ اس تبدیلی نے گجرات کے علاقوں اور سندھ کے درمیان ثقافتی روابط کو متاثر کیا، اس کی بجائے اس زمانے کی ثقافت نے مغرب کی سمت کے علاقوں میں اپنے رابطے کو بڑھایا۔اس درمیانی مدت میں ترتیب پانے والے آرکیٹیکچرل ڈیزائن میں اس رویئے کی جھلک نظر آتی ہے۔ مکلی کے لوگوں کی ترجیح ٹھٹھہ میں دفن ہونا رہی بھی ہو تو جو کچھ ٹھٹھہ قصبہ کے حصے میں آیا وہ آج باقی نہیں بچا، سوائے ایک دو تباہ شدہ ڈھانچوں کے۔
بنگال میں شیر شاہ سوری کے عروج نے ہندوستان کے مغل بادشاہ ہمایوں کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ تیموری بادشاہت کے روایتی پیروکاروں سے کچھ مدد حاصل کرنے کے ہدف کے ساتھ سندھ پہنچنے پر ہمایوں نے شاہ حسن

ارغون سے کافی ٹھنڈے دماغ سے ملاقات کی۔شاہ حسن ارغون نے بھی مکمل طور پر شائستگی کا اظہار کیا لیکن یہ رابطہ صرف پیغامات تک ہی محدود رہا۔ حتیٰ کہ وہ ذاتی طور پر بادشاہ وقت کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے حاضر بھی نہیں ہوا۔اسی طرح اس نے ملحقہ علاقوں کی فصلوں کو بھی تباہ کیا تاکہ پہنچنے والی فوج کو مشکلات پیدا ہوں۔اس مقامی حکمران نے بالآخر ٹھٹھہ کو اپنے قبضے میں ہی روکے رکھنے اور سلطنت دہلی کے بجائے کہیں اور سے مدد حاصل کرنے کا فیصلہ کیا جبکہ عام حالات میں وہ بادشاہ کے سفر اور لشکر کے اخراجات فراہم کرنے کا پابند تھا۔اسی اثناء میں شاہ حسن ارغون کا اچانک انتقال ہو گیا۔[11]

اگرچہ ان میں اور امیر میرزا عیسی میں ٹھٹھہ میں اور سلطان محمود کی طرف سے بھکر کی حکومت سنبھالنے کی وجہ سے رنجش ختم ہو گئی تھی۔ البتہ اس غیر رسمی وقتی انتظام سے بعدازاں الجھن پیدا ہونے کا خدشہ تھا، کیونکہ دونوں ہی ٹھٹھہ اور بھکر کے مابین باقی ماندہ علاقے کی حکومت کے خواہشمند تھے۔ میرزا عیسی نے پرتگالیوں سے امداد حاصل کرنے کی کوشش کی اور حالات کی سختی کے باوجود بھکر پہنچنے کی امید میں جلدی سے سیہون کی طرف آگے بڑھا لیکن اس موقع پر سلطان محمود کی انصاف پسندی نے میدان جیت لیا اور میرزا عیسیٰ کو اس کی پیش کردہ مفاہمت کی تجاویز سے اتفاق کرنا پڑا۔اسی اثنا میں پرتگالی ٹھٹھہ پہنچے، اور انہیں مدد کے لیے بلانے والوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا، کیونکہ انہوں نے میرزا عیسیٰ کو سلطان محمود کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے خود مشاہدہ کیا تھا۔اس وقت ٹھٹھہ میں کوئی بھی ایسی قوت نہیں تھی جو اس فیصلہ کن صورتحال میں مرکزی کردار ادا کر سکے اور پرتگالیوں کو کم از کم اس لشکر کشی کا معاوضہ ہی ادا کر دے۔ نتیجے میں پرتگالیوں کے اس شدید غصے کو ٹھٹھہ کے بے قصور باشندوں (973 ھ / 1565-6) نے ہی جھیلا اور اس کا شدید انھیں شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ پرتگالیوں نے ان کے جان ومال کو بہت نقصان پہنچایا اور شہر کے بعض حصوں کو تباہ کر دیا۔

تاہم اب بھی ہمارے پاس اس دور کے کچھ یورپین سیاحوں کے ذریعہ کچھ نہ کچھ تاریخی مواد دستیاب ہے، جو ہمیں ٹھٹھہ کی ترقی کرتی ہوئی معیشت کا نسبتاً منصفانہ جائزہ پیش کرتا ہے۔وِنگٹن نے ایک روشن تصویر پینٹ کی ہے کیونکہ وہ ٹھٹھہ کو تجارت کے معاملے میں انتہائی اہم قرار دیتا ہے اور اس کی بندرگاہ تک بآسانی رسائی کی اطلاع بھی فراہم کرتا ہے۔اس کی نظر میں سترہویں صدی کے اوائل میں ہندوستان میں ٹھٹھہ ایک خاص اہمیت کا حامل مقام تھا۔یہ ونگٹن نامی سیاح ایک سفر میں جو آف لینڈ، خلیج ہونڈوراس سے لے کر بحر جنوبی تک جان کاک برن اور پانچ دیگر انگریزوں کے ساتھ انجام دیا گیا تھا، انہی باتوں کا ذکر کرتا ہے۔[12] ونگٹن کی اس تاریخی رپورٹ کے ساتھ کہ وہ کیسے ایک انگریز کے ساتھ جو اس سے قبل اپنے ہندوستانی ساتھی کے ساتھ بحفاظت ٹھٹھہ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور پھر وہاں پراسرار حالات میں اس کی موت ہو گئی، اس حادثے کی وضاحت کرتا ہے۔دراصل اس

واقعے کی صرف ایک ہی وضاحت دستیاب تھی کہ اور وہ یہ کہ وہ دو پرتگالی حملہ آوروں کے ذریعہ زہر سے مارا گیا جو وہاں کے یورپی باشندے ہونے کی وجہ سے آسانی سے اس کے قریب پہنچ گئے تھے۔[13]
ٹھٹھہ پر مغلوں کا مغلوں کا قبضہ محض باج گزاری اور اس کے لین دین کا معاملہ نہیں تھا، جیسا کہ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ ابتدا میں مغل جارحیت کی وجہ سے میرزا لانی بیگ، جس نے میر علی باقی کی جگہ حاصل کی تھی وہ مغلوں کی دفاعی ضرورت کو سمجھ گیا تھا، چنانچہ اسی کے مطابق اس نے دوہرا رویہ اختیار کر لیا تھا۔البتہ نئے حکمرانوں اور امراء کو مغل قبضے سے پیدا ہونے والے خلا میں بعض ضروری اقدمات اٹھانا پڑے تھے۔ بعض اوقات ٹھٹھہ سے ان کی غیر حاضری دیدہ دانستہ انجام دیا گیا عمل نہیں ہوتا تھا بلکہ انہیں مغلوں کی عدالت میں حاضر ہونا ضروری تھا تاکہ وہ کسی اور کو وہاں کا حکمران متعارف نہ کروادیں۔اس سے قطع نظر، معاشرے کی مجموعی ترقی اور اس کے ثقافتی طریقوں کے منہج پر غور کرتے ہوئے ہمیں ان لوگوں کا کردار بڑا بھرپور نظر آتا ہے جو اس کی ثقافتی حساسیت سے بڑے پیمانے پر متاثر تھے۔

شاہ حسن ارغون کی تدفین

اس وقت کے حکمران شاہ حسن ارغون جب سندھ کے گاؤں سیہون کے قریب انتقال کر گئے تو ان کی لاش کو ٹھٹھہ لایا گیا اور اسے ندی کے قریب میر احمد ولی کے مقبرے میں دفن کیا گیا۔ تاہم ان کی لاش تین ماہ بعد ہی مکلی میں عارضی تدفین کے مقصد کے لیے بنی ایک شاندار قبر میں منتقل کردی گئ۔ سندھ کی اس ابتدائی تاریخ سے مکلی کے بارے میں زیادہ کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ لیکن اگر ہم اس واقعہ کو دیکھیں تو اس سے مکلی سے ایک خاص طرح کی وابستگی کی ایک اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ معاملہ پہلے سے ہی خاصا اہم ہے کہ بادشاہ کے جسم کو اگرچہ عارضی طور پر دفن کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا اور اسے عارضی طور مکلی کے بجائے ٹھٹھہ میں دفن کیا گیا اور بعد ازاں جسم کی منتقلی کو مکلی میں تدفین سے مشروط کیا گیا لیکن اس جگہ کا انتخاب بھی ٹھٹھہ کی ایک مقدس نوعیت کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس مختصر سے قصے سے مکلی سے منسلک وہ احترام ظاہر ہوتا ہے جو بتاتا ہے کہ یہ ایک ایسی امتیازی جگہ ہے جہاں اگرچہ کسی لاش کو منتقل کے لیے تمام پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ایسی جگہ کو بڑی عزت وتقدیس کا حامل سمجھا گیا اور سمجھا جانا چاہیے جس میں گذر جانے والے بادشاہ کو دفن کیا گیا ہو۔

سید عبد القادر ٹھٹھوی

سید عبد القادر ٹھٹھوی کا کام سال 1607/1016 میں مکمل ہوا۔ مکلی سے متعلق ان کے مخطوطات جن میں اس قبرستان میں دفن کے آغاز کے مدت کا حوالہ موجود ہے۔اس کے لیے احتمال یہی ہے کہ انہوں نے یا تو نے پہلے سے موجود کسی متن سے اشارہ لیا ہو گا، یا وہ عام طور پر مشہور کسی لوک داستان پر انحصار کر رہے تھے۔ بہر حال اب

اس کی تصدیق ناممکن ہے۔ لیکن انہوں نے نے بھی تدفین کے آغاز سے متعلق بڑی متضاد معلومات دی ہیں۔ مثلا" انہوں نے بتایا ہے کہ یہ صوفی پیشوا شیخ حماد جمالی ہی تھے جنھوں نے سلطنت سما کے رئیس وحکمران جام تماچی کو مشورہ دیا کہ اب کے بعد سے مکلی کی پہاڑی پر تدفین کی اجازت دی جائے۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مدت سے پہلے مکلی کی پہاڑیوں پر دفن شدہ انسانی باقیات نہیں ملنی چاہئیں۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ عمومی تدفین سے پہلے اس مقام کا استعمال خاص طور پر کچھ داخلی رسوم ورواج سے مشروط رہا ہو یا کسی قسم کے قواعد وضوابط کے ذریعہ اس کو مشروط کر دیا گیا ہو۔ جیساکہ مقدس ہستیوں کی شفاعت، آخرت کی سختیوں میں نرمی کا تصور وغیرہ۔

عبدالقادر ٹھٹھوی کا بیان مکلی کو ایک تفویض شدہ قبرستان کی حیثیت سے ایک خاص جگہ قرار دینے کی گواہی تو دیتا ہے۔ ان کی نظر میں یہ پہاڑی ایک مقدس جگہ تھی اور اس نے وقت کی مشہور شخصیات کی فانی باقیات کو اپنے دامن میں جگہ دی۔ایک اور تاریخی تحلیل تاریخ سندھ کے دیگر مورخین میں سے بعض کی طرف سے لکھی گئی ہے جن میں ٹھٹھہ سے باہر کے مورخین مثلاً میر علی شیر قانی کا بیان اہم ہے۔ایک مثنوی کا مصنف میر قانی جو دراصل مکلی کے معماروں کی طرح مکلی سے محبت کرتا تھا اور اکثر اس تاریخی مقام پر جایا کرتا تھا۔ نیز وہاں موجود مقبروں کے ساتھ آشنائی پیدا کرنے کی پوری کوشش کرتا تھا۔ اگرچہ اس کا یہ تاریخی بیان مکلی میں دفن ہونے والے کچھ بہت ہی مقدس افراد کی اطلاع دیتا ہے، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے ایک ایسی داستان کو رقم کیا ہے جو سماجی اور ثقافتی نقطہ نظر سے نہایت اہم ہے۔ اگر ہم اس کی تفصیل سے دیکھیں تو علی شیر قانی نے اس جگہ کو ایک مقدس مقام کے طور پر واضح کیا ہے جو خالص اور مقدس افراد کے تدفین کے واقعات سے بھرپور ہے۔ اگرچہ اس نے اپنی تین کتابوں من جملہ الفتح الکرام میں سندھ کی تاریخ میں بڑے پیمانے پر مکلی کا حوالہ دیا ہے[14] جسے سندھ کے فارسی شاعروں سے متعلق ایک اور تاریخی بیان کے ساتھ منسلک کیا گیا تھا۔ان میں ٹھٹھہ اور مکلی کی دیگر مذہبی شخصیات شامل ہیں جن میں سے بعض سے یہ تاریخی بیانات تعلق رکھتے ہیں۔ ٹھٹھہ اور مکلی اور وہاں دفن شدہ افراد کے متعلق قانی نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ یہ جگہ ایک منتخب کردہ جگہ ہے اور ان مذہبی لوگوں کی یہاں تدفین کی وجہ سے بھی اس میں مزید تقدس پیدا ہو گیا ہے۔

جب تک مزید کوئی تاریخ شائع نہیں کی جاتی جو اس قبرستان کے بارے میں وضاحت سے بیان کرے اور اس کے ابتدائی ادوار تدفین کو واضح کرسکے، تب تک ہمارے ہاتھ میں یہی تاریخ ہے یہاں تک کہ عام طور پر مغربی ممالک کے محققین خاص طور پر مکلی نہ پہنچ جائیں اور اس سے متعلق تاریخ کو کھوج ڈالیں۔صدیوں کے بعد بمشکل چند یورپی باشندوں نے اس سائٹ میں کچھ دلچسپی ظاہر کی۔ ان میں بھی ارنسٹ ٹرمپ کے تبصرے دلچسپ ہیں

کیونکہ انہوں نے پورے ہندوستان میں جو بھی ان کے مشاہدے کی روشنی میں میں آیا ہے اس میں مکلی ہل کے کھنڈرات کو سب سے زیادہ شاندار بتایا۔

اس طرح کے تاریخی بیانات کی ایک اور مثال الیگزینڈر ہیملٹن سال 1699 عیسوی کے اشاروں پر مبنی اور زیادہ تر مختصر سی تاریخی وضاحت ہے۔اس نے ایک مسافر کی حیثیت سے بیالیس ٹھیک قبروں اور ان سے متعلق 28 تاریخی رپورٹس جو سنہری ریت کے پتھر سے بنی سیکڑوں خوبصورت نقش ونگار اور انتہائی سجاوٹ والی قبروں کے تذکرے پر مشتمل ہیں، کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے علاوہ کسی نے بھی کوئی اور تفصیل یا علامتی مواد کی اطلاع نہیں دی سوائے برٹن کے جو ایک استثنائی مورد تھا۔ اگرچہ اس نے عید گاہ کی دیوار پر سال 1043 ھ کی تاریخ صحیح طور پر پڑھی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ باقی کے نوشتہ جات پر بھی اس کے تبصرے خاصے دلچسپ ہیں۔وہ کہتا ہے: "یہاں قرآن پاک کے ایسے الفاظ کی نقاشی موجود ہے جس کی اصل خوبصورتی ناقابل بیان ہے۔"[15] وہ آگے بڑھ کر یہ بھی بیان کرتا ہے کہ درحقیقت ان سے کوئی قابل ذکر تاریخی معلومات حاصل کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

دراصل مغربی ممالک میں لوگوں کی تاریخ کا بہت کم حصہ ان کے مقبروں سے سیکھا جاتا ہے جبکہ مسلمان تاریخی نسخہ جات اور تعریفی نوشتہ جات کی بنیاد کو قبول بھی کرتے ہیں اوراس پر اعتماد بھی کرتے ہیں۔ البتہ ہمارے یہاں کی مسیحی یادگاریں کبھی مناسب طریقے سے کبھی محفوظ کی ہی نہیں جاسکیں۔تاہم یہ بتایا جاتا ہے کہ اس طرح تراشی گئی سنگی عبارت پر بعض افراد نے توجہ مرکوز کی اور اس کی بنیادی وجہ ریکارڈ سازی اور نوآبادیاتی دور کے دستاویزاتی کام کا دباو بنی۔ سرسید کی صنادید سندھ اسی زمرے میں انیسویں صدی کے دوسرے نصف کو بیان کرتی ہے۔ دہلی کی تاریخی عمارتوں کے متعلق اس بیان نے شاید سندھ میں کسی کو متاثر کیا ہو۔ سندھ میں انگریز کمشنر کے عملے کے مقامی اہلکار خان صاحب خداداد خان کا کام ایسا ہی ایک اقدام تھا جس پر تین صدیوں تک کسی کا دھیان نہیں گیا۔ صرف پیر حسام الدین راشدی نے کچھ جزوی ذکر کیا جو خدا داد خان کے ذریعہ مکلی سے کچھ تحریروں پر تحقیق کرنے کا ذکر کرتے ہیں۔ اسی دستاویز سے انہوں نے اپنی تحریروں میں بھی آزادانہ طور پر حوالے دیے البتہ اپنے کیریئر کے دوران خان صاحب کا ایک انتھک مصنف ہونا ثابت ہے۔ وہ 1900 تا 1934 میں سندھ کی ایک مختصر تاریخ سمیت مختلف کاموں میں مشغول رہے لیکن ان کا اصلی کام مکلی پر ہے۔البتہ نہ تو انہوں نے اور نہ ہی کسی اور نے مکلی کی سنگی کتبوں اور ان پر موجود عبارات کے بارے خصوصی طور پر لکھا۔ ان کے دیگر کاموں میں بھی اس طرح اس کا کوئی مجموعہ آج تک دستیاب نہیں ہوا۔

حسام الدین راشدی کا کام[16]

یقینی طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ مکلی میں قبروں اور تعمیری ڈھانچے کی تحقیق پر کافی توجہ نہیں دی گئی۔ دستیاب تاریخیں بہت کم تعداد میں اور محدود ہیں اور متاثر کن مقبروں کی عمارتوں کی کچھ تصاویر سے زیادہ پرانی کتابوں میں کچھ نہیں ملتا۔ اگرچہ ان پر بہت بات کی گئی لیکن شاذ و نادر ہی کوئی حوالہ دیا گیا۔ اس طرح کا کوئی مجموعہ آج تک عملی طور پر نامعلوم ہے۔ خداداد خان کے کام کا بھی معقول انداز میں حوالہ نہیں دیا گیا اگرچہ مکلی نامو کے نقشوں میں بہت ساری تحریروں میں ان کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ قابل تعریف ہوتا اگر کم از کم دستیاب معلومات کی حد تک مختصر طور پر ہی سہی، لیکن سنگی کتبوں کے بارے میں کچھ بیان کیا گیا ہوتا لیکن بد قسمتی سے اس بارے میں کوئی بات ہی نہیں کی گئی۔ یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ آیا سنگی کتبوں کا کوئی ریکارڈ بنایا بھی گیا تھا یا نہیں، اور کیا صرف ان کی تعداد کو ہی خداداد خان نے اپنی بیاض میں درج کیا تھا یا نہیں تاہم فوٹ نوٹس لکھنے کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیاض ایک اچھا ماخذ ثابت ہو سکتی تھی اور شاید ہوئی بھی۔ اگر ایسا ہے تو حقیقت یہی ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں دستیاب بہت سارے سنگی کتبے، سنگی نوشتہ جات اور فارسی شاعری کے نمونے ہمارے پاس سے کھو چکے ہیں۔ در حقیقت "مکلی نامو" کو مرتب کرتے ہوئے اس بات کا خیال ہی نہیں رکھا گیا کہ اس میں سنگی کتبوں وغیرہ کا ذکر کیا جائے تاہم یہ خدشہ باقی ہے کہ مکلی نامو میں دستیاب جزوی حوالوں کے علاوہ آج جو کچھ ہمارے ہاتھ میں ہے اس سے کہیں زیادہ غائب ہو چکا ہے۔

عید گاہ

روایتی طور پر عید گاہ ایک اہم مقام تھا۔ اگرچہ ہر سال عید کے دو ہی تہوار ہوتے تھے لیکن معاشرتی طور پر یہ اس دن کے دوران اہم توجہ کا حامل محسوب ہوتا تھا۔ اگرچہ یہ بہت بڑا میدان دو دن کے سوا پورے سال کے لیے استعمال نہیں ہوتا تھا، لیکن اس میں جمع ہونے والی کثیر تعداد کی اہمیت کے تحت مقامی کاری گروں کو اپنی طرف راغب کرنے کا رجحان قوی ہے۔ عید گاہ کی عمارت میں قبلے کی جانب والی دیوار پر ایک کتبہ موجود ہے۔ یہ سن 1043 ھ میں تیار کیا گیا تھا۔ یہ شاید شاہی نشانات میں سے ایک ہے، کیونکہ یہ ایک مشہور حقیقت ہے کہ شاہ جہاں ٹھٹھہ کو اچھی خاصی اہمیت دیتا تھا۔ اس موضوع کے آغاز کی حقیقت کو ایک کتبے میں محفوظ کر دیا گیا تھا۔ بعد میں دو سو چالیس سال کے بعد عید گاہ کی بڑی حد تک مرمت کی گئی۔ اس حقیقت کو بھی ایک تاریخ میں درج کر دیا گیا۔ یہ مشاہدہ کافی دلچسپ ہے کہ دونوں تاریخی واقعات ایک ہی سنگی ڈھانچے کو استعمال کرتے ہیں۔ ایک اپنی تعمیر کا سال پیش کرتا ہے (1043 ھ)، دوسرا اس کی مرمت اور بحالی 1281 ھ کی کہانی سنا رہا ہے۔ اس مجموعے میں ایک ہی خیال کو پیش کیا گیا ہے اور تقریبا ایک ہی مادہء تاریخ کو کچھ تبدیلی کے ساتھ استعمال کیا گیا

ہے۔ پہلے سے تعمیر شدہ سنگی کتبے کو نئی صورتحال میں استعمال کرنے کا دلچسپ رجحان یہاں نظر آتا ہے۔اصل میں یہ ایک پرانا سنگی کتبہ تھا جس کی بعد میں جب مرمت کی گئی تو پرانے کتبے کی حقیقی صورتحال کو محفوظ رکھنے کے لیے بہت احتیاط سے کام لیا گیا گیا حتیٰ کہ مادہء تاریخ میں بھی اسی طرح کی عبارت کا استعمال کیا گیا۔

مکلی کا قبرستان اور فارسی ادب کی یادیں

مکلی کا قبرستان امانتداری کا ایک ایسا جہان ہے جس نے اس گئے گذرے دور میں بھی لٹے پٹے آثار کو ایک خوفزدہ ماں کی طرح دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔اس میں کہیں تو فارسی نثر اور شعر کا رنگ ہے اور کہیں قبرستان کا وحشت ناک انداز میں پھیلتا سناٹا۔ کہیں کلام مقدس کی آیات کا سہارا ڈھونڈتی ظلمت پوش روحیں ہیں اور کہیں ان روحوں سے خوفزدہ لیکن متجسس تحقیق کے وادی کے مسافر۔ کہنے والوں کا بیان ہے کہ اس قبرستان میں نو لاکھ قبریں اور چھے کلومیٹر کا دائرہ ہے جو آل تدفین کی کارگذاری ہے۔[17] یونیسکو رپورٹ کے مطابق یہاں کم از کم سترہ ہزار قبریں ایسی ہیں جو پتھر کی بنی ہوئی، ایک طرح اور ایک ہی انداز کی تعمیر ہوئی ہیں اور ان پر بیش و کم ایک ہی لہجے کے فارسی و عربی اشعار اور نثری عبارات نیز آیات کلام مجیدہ کندہ ہیں۔[18] دراصل، ٹھٹھہ زمانہ ہائے قدیم سے ہی تاخت و تاز کا مرکز اور آماجگاہ سلاطین ویران گران حرث و نسل رہا۔اس علاقے میں آسمان نے کتنے ہی رنگ بدلے اور کبھی ارغون سلطنت کی بلندیاں دیکھیں اور کبھی ترخان سلاطین کے جاہ و حشم کا مطالعہ کیا۔ کبھی صوفیہ کے آثار کو دامن میں جگہ دی اور کبھی ساحل سے بیابان تک پھیلی سندھی تہذیب کے دکھوں کو فارسی اشعار کی صورت سنگی کتبوں پر نظم کیا۔ ٹھٹھہ کی ادبی حیثیت کی تصدیق کے لئے امیر خسرو کا وہ شعر حوالہ ہے جس میں انہوں نے طویل قامت محبوب کی خوش قامتی سمجھانے کے لئے ٹھٹھہ کے لمبے دیودار کے درختوں کے ساتھ موازنہ کیا ہے۔ درج ذیل شعر میں امیر خسرو اچ (شریف) کے بارے میں بات کرتے ہوئے جو بذات خود ایک عالمی ثقافتی میراث ہے، ٹھٹھہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

سرو چو تو در اچہ و در تتہ نباشد گل مثل رخ خوب تو البتہ نباشد

ترجمہ: "تجھ جیسا سرو (قد) نہ تو اچ میں اور نہ ہی ٹھٹھہ میں ہے۔ تیرے خوبصورت چہرے جیسا پھول موجود ہی کہاں ہے۔"

بنابریں، مکلی کے قبرستان میں بہت زیادہ مقدار میں فارسی کتبوں کا پایا جانا خود ایک تحقیق طلب موضوع ہے۔ اردو کے تاریخ دانوں کو اردو زبان شناسی کی ریشہ یابی کے دوران اس پہلو کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے کہ کیونکر اس خطے میں تدفین اور مرگ کی رسوم فارسی مصرعوں سے آمیختہ ہیں۔ لیکن انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہاں جلوہ گاہ امامین کے پاس موجود ایک بڑے احاطے میں موجود قبور پر سیمنٹ پھیر دیا گیا ہے جن پر ایک مقامی فارسی

دان اور بوڑھے مکلی آشنا کے بقول دیوان حافظ کے منتخب اشعار موجود تھے۔ گویا فارسی ادب کی اہم ترین صنف کے اہم ترین اثر کو یوں ضائع کیا گیا تھا کہ جیسے اس کی تاریخ انسانی اور ادبیات جہانی میں کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔اور وجہ کیا تھی، جہالت، ناقدری اور یونیسکو کے چیخنے چلانے کے باوجود اس اہم ترین عالمی ثقافتی ورثے کی عصمت دری کی حد کو پہنچتی ہوئی پامالی۔ بہر صورت، اس ساری تباہی اور بے اعتنائی کے باوجود مکلی کے قبرستان میں فارسی شعر وادب کے بہت زیادہ آثار پائے جاتے ہیں۔ یہاں اس بات کا تقاضا تو کوئی نہیں کر سکتا کہ اس کے خزینہء عبارات میں جام ومینا، رنگ انگیں اور عشق کا جڑاؤ کیوں نہیں دکھتا لیکن قربان تو اس فارسیت کے جایئے کہ جس کے دامن میں ایسا ایسا گوہر پوشیدہ ہے کہ جام وصال ہو یا تلخیء مرگ، ایک ہی مصرعہ دونوں پہ صادق آتا ہے اور کیا اچھا صادق آتا ہے۔

ذرا کھولیے تو دیوان حافظ اور دیکھیے۔ عرس اور عروسی کی ترکیب کا باہمی تعلق خود بخود سمجھ میں آ جائے گا۔ مکلی کے اس عظیم قبرستان میں کوئی سترہ ہزار کے لگ بھگ قبریں ایسی ہیں جو ایک طرز کی اور ایک انداز کی ساختہ ہیں۔ان میں سنگی کتبوں پر فارسی اشعار بھرے پڑے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ جا بجا مادہ ہائے تاریخ اور خبر مرگ کی سطریں، جن کی اکثریت " وفات یافت "کے عنوان سے معنون ہے۔بعض ٹوٹے پھوٹے کتبوں پر نامکمل اور ناقابل فہم تحریریں اور بعض دیگر علامتیں جن سے یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ یہاں کبھی دست صناعی نے گل بوٹے بھی سجائے ہوں گے اور جمالیاتی حس نے شعر وادب کی تعبیرات رسا کو شکستہ دلی کا عنوان قرار بھی دیا ہو گا۔ محققین کی قابل قدر تحقیقات نے تو یہاں تک کھوج ڈالا کہ ان قبروں پر موجود نقاشی کا ہنر انسانی ہنر مندی کے کس شجرے سے پھوٹ کر نکلا اور کس برتے پہ لکیر داریاں اپنے کھینچنے والے ہاتھوں کا فن لہو رنگ تاریخ میں ثبت کرتی چلی گئیں۔اس حوالے سے ہنر اسلیمی اور ہنر نباتی وغیرہ کی تفصیلات خود اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہیں۔

مکلی کے ایک مقبرے پر لکھا ایک نامعلوم شاعر کا شعر اس کے احساسات کی یوں ترجمانی کرتا ہے:

ز دست چرخ کج رفتار غدار　　　دلا تا چند از غم خستہ گردی؟

بہ کوہستان مکلی شو دل زار　　　کہ از دنیای دوں وارستہ گردی

ترجمہ: (اے دل، کب تک اس فلک کج رفتار اور آسمان غدار کے ہاتھوں غموں سے نڈھال ہوتا رہے گا؟ تو اب اس پست دنیا سے منہ پھیر چکا ہے تو بس اب مکلی کے اس کوہستان کا رخ کر لے، یعنی موت کو گلے لگا لے)

عیدگاہ کے کاشی کے قطعاَت پر درج فارسی اشعار

جیسا کہ اوپر اشارہ ہوا، عیدگاہ ایک اہم تاریخی مقام ہے اور عید کے کاشی کے قطعاَت کی تحریریں بھی فارسی ادبیات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ یہاں کاشی کے چار قطعاَت پر مشتمل یہ اشعار کندہ ہیں:

بلبل باغ جمال مصطفےٰ ہست شاہ حیدر مشکلکشا
خدایا بحق بنی فاطمہ (رض) کہ برقول ایماں کنم خاتمہ
اگر دعوتم رد کنی ورقبول من ودست دامان آل رسول
... شدم ازین پنجتن ... فاطمہ حسین(رض) حسن(رض)

ترجمہ: "مصطفیٰ (ص) کے جمال کے باغ کے بلبل، مشکل کشا، بادشاہ حیدر (علیہ السلام) ہیں۔ اے خدا بحق اولاد فاطمہ (س) میرا خاتمہ ایمان کی بات پر فرما۔ تو میری دعا کو ردّ کر دے یا قبول فرمائے میں بہرصورت آل رسول ﷺ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑوں گا۔۔۔۔ ان پنج تن پاک سے ہوا۔۔۔۔۔ فاطمہ، حسین، حسن علیہم السلام۔"

مزار امیر سید طاہر شاہ کے مقبرے پر یہ فارسی عبارات ذیل میں ہیں: " مزار گاہ شریف حاجی بابا سندھ میر سید طاہر ابن میر سید محمد حسن ابن میر سید عبدالقادر ابن میر سید محمد ہاشم حسینی نقوی غفر اللہ لھم

HAJI BABA SIND

1259

اسی طرح ایک اور قطعے پر درج ذیل فارسی شعر مرقوم ہے:

غفار

۱۲۸۱

چون اللہ بخش شہ آل عباس زیب ترمیم این مصلی کرد
بے سر جدوجهد خوان سالش کعبہ اھل فضل زیبا کرد

سنہ ۱۲۸۱

ترجمہ: " جبکہ آل عباس کے بادشاہ اللہ بخش نے اس مصلیٰ کی ترمیم اور آرائش انجام دی۔ تو خاصی کوشش سے اس کے سال کا شعر کا کہا کہ کعبہ کو صاحبان فضل نے خوبصورت بنایا ہے۔"

نتیجہ

اوپر بیان شدہ حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکالنا چنداں دشوار نہیں کہ مکلی ایک عظیم ورثے کی حامل ایک دنیا ہے اور یہاں کا قبرستان جو کہ ہمارا ایک انتہائی اہم ثقافتی ورثہ شمار ہوتا ہے، بتدریج تباہی کی جانب بڑھ رہا ہے۔[19] لہٰذا ہمارے ذہن میں یہ بات رہنی چاہیئے کہ اگر اس تباہی کا سدّباب نہ کیا گیا تو اگلی چند دہائیوں تک اس عالمی ورثے

کے آثار صرف کتابوں اور مقالوں ہی میں باقی رہ جائیں گے جس میں ہماری ناکامی رسوائی تو ہے ہی، محرومی بھی ہے۔ بالآخر ایسا عالمی ثقافتی ورثہ کتنی صدیوں بعد ہماری تاریخ کی زینت بنے گا کہ جسے ہم اقوام عالم کے یہاں اپنے فخر کا باعث شمار کر پائیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس قبرستان پر کئی جہات سے تحقیقات کی جائیں۔ مکلی کے عالمی ورثہ کے حامل قبرستان کو اور اس کے مٹتے ہوئے آثار کو تحقیق کا موضوع قرار دیا جانا اوراس ورثے کو خصوصا اگلی نسلوں کے تعارف کے لئے مقالہ جات اور نوشتہ جات کی صورت میں باقی رکھنا ازبس ضروری ہے۔ اسی طرح اس قبرستان کے کتیبوں کی صورت میں موجود یہاں مختلف زبانوں پر تحقیقی کام انجام دینا ضروری ہے اور آئندہ کے محققین کا فرض ہے کہ اس قبرستان کے ادبی اور ہنری نیز ثقافتی پہلوؤں کی تحقیق اور جمع آوری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔

*****

حوالہ جات

1۔یونیسکو رپورٹ 2011ء۔

2. The International Archives of the Photogrammetry, Remote Sensing and Spatial Information Sciences, Volume XLII-2/W15, 2019 27th CIPA International Symposium "Documenting the past for a better future", 1–5 September 2019, Ávila, Spain

3. Wilson, 1997: 206; Quddus, 1992: 232-33.

4. Lashari, 1995: pl. AK.

5۔ یونیسکو، 2016۔

6. Captain Wood, Journey to the Source of the Oxus, 1872, p.8,

7. Sir Jadunath Sarkar's Manuscript, refer H. Beveridge (tr.) Tarikh i Mubarak shahi, by Yahya bin Ahmad bin Abdullah Sirhandi, Low Price Publications, Delhi 1990 (R), p.

8. Tarikh Feroz Shahi, Barani, Calcutta 1862, p. 535-6, & Tarikhi-Feroz Shahi, Shams Afif, Calcutta. 1890, p. 19-20; see also Agha Mehdi Hussain, 1963, Tughlaq Dynesty. S. Chand & Co. New Delhi, p. 386.

9۔ایس پی چھبیلانی، *سندھ میں معاشی حالات* (حیدرآباد، سندھی ادبی بورڈ، نیوایڈیشن1995ء)، 99۔

10. Dani, A.H., *Thatta, Islamic Architecture*, Islamabad, 1982. 20

11. 962H /1555.

12۔ولیم فوسٹر، *ہندوستان میں ابتدائی سفر* (ایچ ملفورڈ، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 1921ء)، 1188-233۔

13۔ایضا، 222۔

14 ۔ میر علی شیر قانی، *تذکرہ مقالات شوریٰ*) سندھ ادبی بورڈ، کراچی، ۱۹۵۷)25۔

15 . Richard F. Burton, Sind Revisited: With Notices of The Anglo-Indian Army; Railroads; Past, Present, and Future, etc., Richard Bentley and Son, London, 1877, pp. 148-9

16 . Rashdi, Hussamuddin ،Makli Namo (Qani, A.S., 1965., ed. Hyderabad.)
17. Pithawala, 1959: 70; Dani, 1982: 9; Qani, 1965: 78-80; 1971: 150, 560-61).
18 . The essence of the World Heritage Convention: The General Conference of UNESCO adopted on 16 November 1972
19. ICOMOS. Paris, Avril 1981.

Bibliography

1) Agha Mehdi Hussain, 1963, Tughlaq Dynesty. S. Chand & Co. New Delhi, p. 386.
2) Captain Wood, *Journey to the Source of the Oxus*, 1872,
3) Chabelani, S.P, Sindh may Maa'shi Halāt, Hyderabad: Sindhi Adabi Board, 1995.
4) Dani, A.H., *Thatta, Islamic Architecture*, Islamabad, 1982.
5) Hussamuddin -Rashdi,, Makli Namo ,Qani, A.S., 1965., ed. Hyderabad.
6) Richard F. Burton, Sind Revisited: With Notices of The Anglo-Indian Army; Railroads; Past, Present, and Future, etc., Richard Bentley and Son, London, 1877,
7) Shairqani, Meer Ali, Tazkira Makalāt-e Shura, Karachi: Sindhi Adabi Board, 1957.
8) Sir Jadunath Sarkar's Manuscript, refer H. Beveridge (tr.) Tarikh i Mubarak shahi, by Yahya bin Ahmad bin Abdullah Sirhandi, Low Price Publications, Delhi 1990 (R),
9) Tarikh Feroz Shahi, Barani, Calcutta 1862.
10) *Tarikhi-Feroz Shahi*, Shams Afif, Calcutta. 1890,
11) The essence of the World Heritage Convention: The General Conference of UNESCO adopted on 16 November 1972
12) The International Archives of the Photogrammetry, Remote Sensing and Spatial Information Sciences, Volume XLII-2/W15, 2019 27th CIPA International Symposium "Documenting the past for a better future", 1–5 September 2019, Ávila, Spain
13) William Foster, Hindustan may Ibtedai' Safar, H. Milford, Oxford: Oxford University Press, 1921
14) Wilson, 1997: 206; Quddus, 1992.